رسائل و مسائل

مہر کے متعلق ایک ضروری مسئلہ

"اگر بوقتِ نکاح زرِ مہر کی صرف تعداد مقرر کر دی گئی اور اس امر کی تصریح نہ کی گئی ہو کہ یہ مہر معجل ہے یا مؤجل تو آیا اس کو معجل قرار دیا جائے گا یا مؤجل؟ اس مسئلہ میں علماء سے استفسار کیا گیا مگر جوابات مختلف آئے۔ مثلاً چند جوابات یہ ہیں :-

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب و دیگر علماءِ دہلی :

"اگر مہر میں مؤجل کی تصریح بھی ہو مگر اجل مجہول بجہالت فاحشہ ہو تو مہر معجل ہو جاتا ہے۔ اور جبکہ معجل یا مؤجل کا لفظ استعمال نہ کیا جائے بلکہ واجب الادا کا لفظ لکھ دیا جائے تو یہ بھی معجل ہوگا کیونکہ بغیر ذکرِ اجل کے مؤجل نہیں ہو سکتا۔ الا اذا جهل الاجل جهالة فاحشة فيجب حالا۔ غايه (در مختار) وان كانت جهالة متفاحشة كالى الميسرة او الى هبوب الريح او الى ان تمطر السماء فالاجل لا يثبت ويجب المهر حالا۔ كذا فى غاية البيان (رد المحتار)"

مولانا سعید احمد صاحب مدرس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ :

"مہر مؤجل اس وقت ہوگا جب بوقت عقدِ نکاح ادائے مہر کے لیے وقت اور تاریخ کی تعیین ہو ورنہ معجل۔ یہی حال تمام معاملات کا ہے۔ اگر کسی نے ایک دوکان سے کوئی چیز خریدی اور بات چیت میں نقد یا تاخیر تعیینِ وقت کا ذکر نہیں آیا تو یہ معاملہ بھی معجل کے حکم میں ہوگا، خریدار خواہ فوراً قیمت دیدے یا بعد میں دینے کا وعدہ کرے۔ بہر صورت معجل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوض فوراً ادا کیا جائے بلکہ صاحبِ حق کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ فوراً یا جب چاہے اپنے حق کا مطالبہ کرے اور معاملۂ مؤجلہ میں اجل اور تاریخ سے پہلے مطالبہ اور تقاضے

کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس تفصیل کی رو سے معاملہ مسئولہ میں زر مہر معجل ہے اس لیے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ اور دعویٰ کر سکتی ہے"۔

مولانا سید سلیمان ندوی:

"زر مہر میں اگر معجل یا موجل کی کوئی تفصیل نہیں ہے تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ وقایہ میں ہے و المعجل والموجل ان بینا فذلك والا فالمتعارف۔ اگر معجل اور موجل دونوں بیان کر دیے گئے ہیں تو جیسا بیان کیا گیا ہے ویسا ہوگا ورنہ عرف کا اعتبار ہوگا"۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نائب مفتی ریاست پٹیالہ و دیگر علماء:

"اس صورت میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا (حوالہ وہی مختصر وقایہ کا ہے)، اگر عرف یہ ہے کہ ایک عورت ایسے غیر مبین مہر کو صرف شوہر کی وفات یا طلاق ہی کے بعد حاصل کر سکتی ہے تو وہ شوہر کی وفات یا طلاق سے پہلے اسے وصول کرنے کا حق نہیں رکھتی"۔

اس اختلاف کا حل کیا ہے؟ براہ کرم آپ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں"۔

قرآن اور حدیث کی رو سے مہر در اصل اُس حق زوجیت کا معاوضہ ہے جو ایک مرد کو اپنی بیوی پر حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:-

وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم (النساء - ۴)	ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں، تمھارے لیے حلال کیا گیا کہ اپنے مالوں کے عوض اُن سے طلب نکاح کرو۔
فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النساء - ۴)۔	پس جو لطف تم نے اُن سے اُٹھایا ہے اُس کے بدلے ان کے مہر بطور ایک فرض کے ادا کرو۔
وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ (النساء - ۳)	اور تم وہ مال کیسے لے سکتے ہو جبکہ تم میں سے ایک دوسرے سے اختلاط کر چکا ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہر ہی وہ چیز ہے جس کے عوض مرد کو عورت پر شوہرانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ پھر اس کی مزید تصریح وہ احادیث کرتی ہیں جو اس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ صحاح ستہ اور دارمی اور مسند احمد میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:

اَحَقُّ الشُّرُوْطِ اَنْ تُوْفُوْا بِهٖ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوْجَ۔	تمام شرطوں سے بڑھ کر جو شرط اس کی مستحق ہے کہ تم اسے پورا کرو وہ شرط وہ ہے جس پر تم عورتوں کی شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو۔

لعان وہ مشہور مقدمہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زوجین کے درمیان تفریق کرائی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ جب تفریق ہو چکی تو شوہر نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا مال مجھے واپس دلوایا جائے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

لَا مَالَ لَكَ، اِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا وَاِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهَا فَذٰلِكَ اَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا (مسلم۔ کتاب اللعان)	مال لینے کا تجھے حق نہیں۔ اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو اس کی شرمگاہ جو تو نے اپنے لیے حلال کی تھی اس کے معاوضہ میں وہ مال ادا ہو چکا، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال لینے کا حق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔

اس سے بھی زیادہ تصریح ایک اور حدیث میں ہے جو امام احمد اپنی مسند میں لائے ہیں کہ:

مَنْ تَزَوَّجَ اَمْرَاَةً بِصَدَاقٍ وَنَوٰى اَنْ لَا يُؤَدِّيَهُ فَهُوَ زَانٍ	جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ یہ مہر دینا نہیں ہے وہ زانی ہے۔

ان تمام نصوص سے مہر کی یہ حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی رسمی و نمائشی چیز نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جس کے معاوضہ میں ایک عورت ایک مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ اور ان نصوص کا اقتضاء یہ ہے کہ استحلالِ فرج کے ساتھ ہی پورا مہر فوراً واجب الادا ہو جائے، الّا یہ کہ زوجین کے درمیان اس کو مؤخر

کر دینے کے لیے کوئی قرار داد ہو چکی ہو۔

پس زرِ مہر کی ادائیگی کے معاملہ میں اصل تعجیل ہے نہ کہ تاجیل۔ مہر کا حق یہ ہے کہ وہ استخلالِ فرج کے ساتھ ہر وقت ادا ہو اور یہ محض ایک رعایت ہے کہ اس کو ادا کرنے میں مہلت دی جائے۔ اگر مہلت کے بارے میں زوجین کے درمیان کوئی قرار داد نہ ہوئی ہو تو اعتبار اصل (یعنی تعجیل) کا کیا جائے گا نہ کہ رعایت (یعنی تاجیل اور مہلت) کا۔ یہ بات شارع کے منشأ کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے کہ تاجیل کو اصل قرار دیا جائے اور تاجیل و تعجیل کے غیر مصرح ہونے کی صورت میں زرِ مہر کو آپ سے آپ موجل ٹھیرایا جائے۔

فقہائے حنفیہ کے درمیان اس مسئلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ غایۃ البیان میں ہے:

فان کان بشرط التعجیل او مسکوتاً عنہ یجب حالاً ولھا ان تمنع نفسھا حتی یعطیھا المھر۔	اگر مہر بشرطِ تعجیل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو (کہ معجل ہے یا موجل) تو وہ فوراً واجب ہوگا اور عورت کو حق ہوگا کہ اپنے آپ کو شوہر سے روک لے جب تک کہ وہ مہر ادا نہ کرے۔

اور شرح العنایہ علی الہدایہ میں ہے:

فان سموا المھر ساکتین عن التعجیل والتاجیل ماذا یکون حکمہ؟ قلت یجب حالاً فیکون حکمہ حکم ما شرط تعجیلہ	پھر اگر مہر مقرر کر دیا گیا اور معجل یا موجل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ فوراً واجب ہوگا، اس کا حکم اس مہر کا سا حکم ہے جس کے بیچے تعجیل کی شرط کی گئی ہو۔

اور اسبیجابی میں ہے:

ان کان المھر معجلاً او مسکوتاً عنہ	اگر مہر معجل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو

فانه یجب حالا لان النکاح عقد معاوضة وقد تعین حقه فی الزوجة فوجب ان یتعین حقها وذلك بالتسلیم

تو وہ فوراً واجب ہوگا کیونکہ نکاح ایک عقد یا معاوضہ ہے، جب زوجہ میں شوہر کا حق متعین ہوگیا تو واجب آیا کہ عورت کا حق بھی متعین ہو جائے اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہر ادا کر دیا جائے۔

رہا دوسرا گروہ، تو وہ کہتا ہے کہ اس معاملہ میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

فان لم یبینوا قدر المعجل ینظر الی المرأة والی المهر انه کم یکون المعجل لمثل هذه المرأة من مثل هذا المهر فیجعل ذلك ولا یقدر بالربع والخمس بل یعتبر المتعارف

اگر معجل کی مقدار واضح نہ کی گئی ہو تو دیکھا جائے گا کہ عورت کس طبقہ کی ہے اور مہر کتنا ہے اور یہ کہ ایسی عورت کے لیے ایسے مہر میں سے کس قدر معجل قرار دیا جاتا ہے۔ بس اتنی ہی مقدار معجل قرار دی جائے۔ ایک چوتھائی یا پانچویں حصہ کی تعیین نہ کر دینی چاہیے بلکہ جو رواج ہو اس کا اعتبار کرنا چاہیے۔

اسی رائے کی تائید علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وان لم یشترط تعجیل شیء بل سکتوا عن تاجیله وتعجیله فان کان عرف فی تعجیل بعضه وتاخیر باقیه الی الموت او المیسرة او الطلاق فلیس لها ان تحتبس الا الی تسلیم ذلك القدر

اور اگر کسی حصۂ مہر کی تعجیل کی شرط نہ کی گئی ہو بلکہ تعجیل اور تاجیل سے سکوت اختیار کیا گیا ہو تو رواج کو دیکھا جائیگا اگر رواج یہ ہے کہ ایک حصہ معجل قرار دیا جاتا ہے اور باقی حصہ موت تک یا خوش حالی تک یا طلاق تک موخر رکھا جاتا ہے تو عورت صرف اتنی ہی مقدار وصول ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے روکنے کا حق رکھتی ہے۔

اصولی حیثیت سے دیکھا جائے تو پہلے گروہ کی رائے قرآن و حدیث کے منشا سے زیادہ مطابقت رکھتی

ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کی رائے بھی بے وزن نہیں ہے۔ ان کے قول کا مدعا یہ نہیں ہے کہ مہر کے باب میں تاجیل اصل ہے اور جب تاجیل و تعجیل کی صراحت نہ ہو تو معاملہ اصل یعنی تاجیل کی طرف راجع ہونا چاہیے، بلکہ وہ اپنے فتوے میں ایک اور قاعدے کا لحاظ کرتے ہیں جسے شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں معاملات کے متعلق جو طریقہ عام طور پر مروج ہو اس کی حیثیت افراد کے درمیان ایک غیر مسطور قرارداد کی سی ہوتی ہے، اگر اس سوسائٹی کے دو فریق باہم کوئی معاملہ طے کریں اور کسی خاص پہلو کے بارے میں بصراحت کوئی قرارداد نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس پہلو میں وہ مروجہ طریقہ پر راضی ہیں۔

بلاشبہ یہ قاعدہ شریعت میں مسلّم ہے، اور اس لحاظ سے فقہاء کے دوسرے گروہ کی رائے بھی غلط نہیں ہے، لیکن قبل اس کے کہ ہم کسی خاص سوسائٹی میں اس قاعدے کو جاری کریں، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت نے رواج کو بطور ایک ماخذ قانون (SOURCE OF LAW) کے تسلیم نہیں کیا ہے کہ جو کچھ رواج ہو وہی شریعت کے نزدیک حق ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ غیر متقی سوسائٹی اور اس کے غیر منصفانہ رواجوں کو قبول کرنے کے بجائے ان کو بدلنا چاہتی ہے اور صرف ان رواجوں کو تسلیم کرتی ہے جو ایک اصلاح شدہ سوسائٹی میں شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ لہٰذا رواج کو غیر مسطور قرارداد مان کر مثل قانون نافذ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس سوسائٹی کے رواج کو ہم یہ حیثیت دے رہے ہیں کیا وہ ایک متقی سوسائٹی ہے؟ اور کیا اس کے رواج شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کی تبعیت میں پیدا ہوئے ہیں؟ اگر تحقیق سے اس کا جواب نفی میں ملے تو اس قاعدے کو مثل قانون جاری کرنا عدل نہیں بلکہ قطعاً ایک ظلم ہوگا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم ہندوستان کی موجودہ مسلم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تعلقات زن و شو کے معاملہ میں اس نے خواہشاتِ نفس کی پیروی اختیار کرکے اس توازن کو بہت کچھ بگاڑ دیا ہے جو شریعت نے قائم کیا تھا، اور بالعموم اس کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہے جو شریعت کی روح

اور اس کے احکام سے صریحاً منحرف ہیں۔ اسی مہر کے معاملہ کو لے لیجیے جس پر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بالعموم مہر کو محض ایک رسمی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اس کی وہ اہمیت قطعاً نہیں ہے جو قرآن و حدیث میں اس کو دی گئی ہے۔ نکاح کے وقت بالکل ایک نمائشی طور پر مہر کی قرارداد ہو جاتی ہے مگر اس امر کا کوئی تصور ذہنوں میں نہیں ہوتا کہ اس قرارداد کو پورا بھی کرنا ہے۔ بارہا ہم نے مہر کی بات چیت میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سنے ہیں "میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے" گویا یہ فعل محض ضابطہ کی خانہ پُری کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علم میں ۸۰ فی صدی نکاح ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر سرے سے کبھی ادا ہی نہیں کیا جاتا۔ زرِ مہر کی مقدار مقرر کرنے میں اکثر جو چیز لوگوں کے پیشِ نظر ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ اسے طلاق کی روک تھام کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس طرح عملاً عورتوں کے ایک شرعی حق کا عدم کر دیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی گئی کہ جس شریعت کی رو سے یہ لوگ عورتوں کو مردوں پر حلال کرتے ہیں وہ مہر کو استحلالِ فروج کا معاوضہ قرار دیتی ہے اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی نیت نہ ہو تو خدا کے نزدیک عورت مرد پر حلال ہی نہیں ہوتی۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جس سوسائیٹی کا عرف اتنا بگڑ چکا ہو اور جس کے رواج نے شریعت کے احکام اور اس کی روح کے بالکل خلاف صورتیں اختیار کر لی ہوں، اس کے عرف و رواج کو از روئے شریعت جائز قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ جن فقہاء کی عبارتیں اعتبارِ عرف کی تائید میں نقل کی جاتی ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ بگڑی ہوئی سوسائیٹی تھی اور نہ اس کے خلاف شریعت رواج۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ ایک اصلاح شدہ سوسائیٹی اور اس کے عرف کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ کوئی مفتی مجرد ان کی عبارتوں کو نقل کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اصولِ شریعت کی روشنی میں ان کی عبارتوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور یہ تحقیق کر لے کہ جن حالات میں انھوں نے وہ عبارتیں لکھی تھیں اُن سے وہ حالات مختلف تو نہیں ہیں جن پر آج انھیں چسپاں کیا جا رہا ہے۔

"پردہ" پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

"..... کالج کے ایک ہندو پروفیسر صاحب کو میں نے آپ کی کتاب "پردہ" پڑھنے کو دی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو خط لکھا ہے وہ آپ کو بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ان کے سوالات کا جواب ہم بھی دے سکتے ہیں لیکن آپ خود جواب دینے کی تکلیف فرمائیں تو یہ ان کے لیے زیادہ تسلی بخش ہوگا۔"

جس خط کا حوالہ دیا گیا ہے وہ انگریزی میں ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"آپ نے جو کتاب مجھے دی تھی اُسے میں نے ختم کر لیا ہے۔ میں نے اسے بہت غور سے پڑھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بڑی حد تک مصنف کے خیالات سے متفق ہوں۔ مگر ہندو سوسائیٹی میں ہندو عورتوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا ہے اُس پر مصنف کی رائے زنی ہندو رسم و رواج سے ناواقفیت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو قوم سیاسی حیثیت سے گر گئی ہو اس کے اندر بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہندو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، تاہم کسی ہندو خاندان میں عورت کو لونڈی کی حیثیت نہیں دی جاتی جیسا کہ مصنف نے ایک جگہ بیان کیا ہے بلکہ اس کے برعکس ایک دیوی کی طرح اس کی عزت و حرمت ملحوظ رکھی جاتی ہے

مگر آپ کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ انسانی سوسائیٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ ایک نامی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ تغیر قبول کرتی رہتی ہے، خواہ یہ تغیر بہتری کی جانب ہو یا بدتری کی جانب۔ ہمارے رواج، آداب و اطوار، زبان، لباس، خیالات وغیرہ ہم بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے بچوں کا ہمارے نقش قدم پر چلنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ غالباً وہ غلطیاں کرنے کا حق بھی مانگتے ہیں۔ میں چونکہ ایک آزاد خیال آدمی ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، اور یہی حق ایک عورت کو بھی ہے۔ پھر کیوں اس سے مطالبہ کیا جائے بلکہ زبردستی اسے مجبور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے؟ مصنف نے

اپنے دعاوی کی تائید میں مغربی مصنفین کی تحریریں نقل کی ہیں، مگر یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ گجرات، مہاراشٹر اور مدراس کی سیاحت کرتا اور خود تحقیق کرتا کہ آیا ان صوبوں کی عورتیں، جنھوں نے صدیوں سے کبھی پردہ نہیں کیا ہے، کسی اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں؟"

پروفیسر صاحب کی طرح غالباً بہت سے دوسرے ہندو بھائیوں نے بھی میری کتاب کو ملاحظہ فرمایا ہوگا اور ممکن ہے کہ ان کو بھی یہ بات بُری لگی ہو گی جس کی شکایت پروفیسر صاحب نے کی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں پبلک میں اپنے مدعا کی تشریح کر دوں۔ ہندو سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے میری مراد وہ برتاؤ نہیں ہے جو ہمارے ہندو بھائی عملاً اپنے گھروں میں اپنی بیویوں، بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں، بلکہ وہ حیثیت ہے جو ہندو قانون اور فلسفۂ اجتماع نے عورتوں کو دی ہے۔ اس چیز کا میں نے جس حد تک مطالعہ کیا ہے، میں کسی تعصب کے بغیر اس سے وہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں جو پروفیسر صاحب نے میری کتاب میں ملاحظہ فرمایا، اور میرا خیال ہے کہ خود ہندوؤں میں بھی جو حضرات اصلاحِ معاشرت کے لیے کوشش کر رہے ہیں ان میں سے اکثر اپنی سوسائٹی میں عورتوں کی قانونی، معاشی اور معاشرتی حیثیت کو قابلِ اطمینان نہیں پاتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بہت سی خرابیاں اس انحطاط کا نتیجہ ہیں جس میں ہندو قوم صدیوں تک مبتلا رہی ہے، لیکن آخر ان کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے جب تک کہ جرأت کے ساتھ ان کو محسوس اور متحقق نہ کیا جائے؟ میں نے اپنی کتاب میں صرف ہندوؤں ہی پر نہیں بلکہ موجودہ زمانہ کی مسلمان قوموں پر بھی نکتہ چینی کی ہے، اور مغربی اقوام پر تو میری تنقید بہت سخت ہی، مگر کسی قوم کے معاملہ میں بھی میری تنقید کا مقصد تحقیر اور عیب چینی نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک کو اُس غلطی پر متنبہ کروں جس میں وہ مبتلا ہے اور اُس اصلاح کی طرف توجہ دلاؤں جس میں مجھے اسکی فلاح نظر آتی ہے۔

پروفیسر صاحب کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ سوسائٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ نشوونما اور تغیر قبول کرنے والی چیز ہے۔ اور یہ بات خود پروفیسر صاحب نے تسلیم فرمائی ہے کہ تغیر لازماً صحیح ہی نہیں ہوتا، غلط بھی

ہوتا ہے۔ اب یہ سمجھنے سے میں معذور ہوں کہ انسانی سوسائیٹی یا اس کے افراد اگر غلط سمت میں تیز قبول کر رہے ہوں تو انھیں ٹھوکریں کھانے اور تباہی و نقصان کی طرف جانے کے لیے کیوں چھوڑ دیا جائے؟ کیوں نہ صحیح سمت کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے؟ خصوصاً جو شخص جانتا ہو کہ صحیح سمت کونسی ہے وہ اگر لوگوں کو غلط سمت میں بڑھتے ہوئے دیکھ کر خاموش بیٹھا رہے تو اس کے مجرم ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ میں آزادی کے اس مفہوم کو کبھی نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آدمی کو حماقت اور خودکشی اور سوسائیٹی کی تخریب کے لیے بھی آزاد ہونا چاہیے۔

"بلکہ بزور اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے"، پروفیسر صاحب کا یہ فقرہ بڑا دلچسپ ہے۔ اگر جبر سے مراد مار پیٹ کر زبردستی نقاب ڈلوانا ہے تو میں پروفیسر صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ واقعہ کبھی پیش نہیں آیا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی پیش نہ آئے گا۔ البتہ اگر زور اور جبر سے مراد سوسائیٹی کی رائے اور اس کے رائج کردہ طریقوں کی طاقت ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اجتماعی زندگی اس طاقت کے استعمال سے کبھی خالی نہیں رہی ہے اور نہ کبھی خالی کی جا سکتی ہے۔ سوسائیٹی کا لفظ اُس روز بر معنی سے خالی ہو جائے گا جس روز وہ اس طاقت اور اس کے استعمال سے خالی ہو جائے گی۔ یہ آج کل کی "آزاد خیال" سوسائیٹی جس میں ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر آزاد خیالی کا مدعی اور آزادیِ رائے کے احترام کا دعوے دار ہے، اس کے دعووں کی حقیقت ایک ذرا سی آزمائش سے کھل سکتی ہے۔ ابھی کوئی شخص اس سوسائیٹی میں ڈاڑھی رکھ لے، پھر آپ خود دیکھ لیں گے کہ اسے کس کس طرح شرمندہ کیا جاتا ہے اور کیسے کیسے فقرے اس پر کسے جاتے ہیں۔ یہ تجربہ آپ جب چاہیں کر سکتے ہیں، اس سے آپ کو بآسانی اس بات کا ثبوت مل جائے گا کہ "آزاد خیالی" کے اس دور میں بھی سوسائیٹی کی فطرت نہیں بدلی ہے۔ وہ آج بھی افراد کی "آزادیِ خیال" کے مقابلہ میں اپنی اجتماعی پسند اور اپنے اجتماعی معیارِ تہذیب و ثقافت کو اسی جبر و زور کے ساتھ مسلط کر رہی ہے جس طرح ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب پرانی سوسائیٹی کے کسی شخص میں ان "آزاد خیال" حضرات کے منشاء کے مطابق تغیر رونما ہوتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ کسی کو اس پر ملامت کرنے کا حق نہیں ہے، ہر شخص کو اپنے عمل میں آزاد ہونا چاہیے۔ سوسائیٹی کون ہوتی ہے کہ ایک آدمی کو

وہ طریقہ اختیار کرنے سے منع کرے جسے اُس نے خود اپنے لیے پسند کیا ہے۔ لیکن اگر نئی سوسائیٹی کے کسی شخص میں ان کے منشا کے خلاف تغیر واقع ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ کوئی آزاد خیال عورت پردے کو خود پسند کرکے نقاب اوڑھنے، یا کالج کا کوئی طالب علم "ملائیت" اختیار کرکے ڈاڑھی اور نماز کا پابند ہو جائے اور سینما اور برج اور دوسرے بیہودہ افعال سے پرہیز کرنے لگے۔ تو یہی "آزاد خیال" سوسائیٹی پوری "دقیانوسیت" اور "تاریک خیالی" کے ساتھ وہ سب تدابیر اُس کے اِس تغیر کو روکنے اور اسے اپنے سابق طریقے کی طرف پھیر لانے کے لیے استعمال کرتی ہے جو پرانی سوسائیٹی استعمال کیا کرتی تھی۔ بلکہ ٹرکی اور روس کے "آزاد خیالوں" نے تو اس بیسویں صدی میں "دقیانوسیت" کی حد کر دی ہے۔ "آزاد خیال" کے ان متعصب دشمنوں نے اُن عورتوں کے نقاب زبردستی نوچ نوچ کر پھینک دیے ہیں جو بے نقاب ہونا نہ چاہتی تھیں، اُن لوگوں کو زبردستی ہیٹ پہنوائے ہیں جو اپنے سروں پر پگڑی رکھنا چاہتے تھے، پوری پوری آبادیوں کو لاطینی رسم الخط اختیار کرنے پر از روئے قانون مجبور کیا ہے جو عربی یا فارسی رسم الخط کی پابند رہنا چاہتی تھیں۔

پروفیسر صاحب کا آخری مشورہ قابلِ قدر ہے، مگر وہ مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اس لیے شاید انھوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ میں تمام عمر کسی پرانے مسلمان خاندان کے ماحول میں گھرا رہا ہوں اور پھر کتابوں کے مطالعہ سے کچھ رائیں میں نے قائم کر لی ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مجھے دنیا کو آنکھوں سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے کا اچھا خاصا موقع ملا ہے۔ گجرات، دکن، مہاراشٹر اور شمالی ہند میں بھی میں نے قریب قریب تمام طبقوں کے اندرونی و بیرونی حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور انہی مشاہدات نے مجھ کو بالآخر اس بات کا قائل و معترف بنا دیا کہ سوسائیٹی کی اخلاقی صحت اور صالح نشوونما کے لیے معاشرت میں اُن حدود کی پابندی ضروری ہے جو اسلام نے تجویز کی ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جبکہ میں خود پردے کا مخالف تھا، حتیٰ کہ میں نے مصر کے ایک آزاد خیال شخص کی کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا جس میں اس نے "آزادیٔ نسواں" کی پرزور حمایت کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ترجمہ شائع نہیں ہوا، بلکہ اس کا مسودہ بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گیا اور

اس طرح میں خلق خدا کی گمراہی کا سبب بننے سے بچایا گیا ــــ میں نے یہ بات کبھی نہیں کہی، اور نہ ایسی بات کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جن طبقوں میں زنانہ اور مردانہ سوسائٹی کے درمیان حدبندیاں کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں وہ سب اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں، مگر اپنے مشاہدات کی بنا پر مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ایسے طبقوں سے اخلاقی پستی قریب تر ہے اور ان کے اس میں مبتلا ہو جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جہاں پولیس کا انتظام نہیں ہے وہاں سب چور اور ڈاکو ہی بستے ہیں، مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہاں چوری اور ڈاکے کا ارتکاب آسان تر ہے اور بدامنی پھیل جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اجتماعی زندگی میں افراد کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا جتنی اہمیت رکھتا ہے، اتنی ہی اہمیت ایسے خارجی حدود و ضوابط کی بھی ہے جن سے افراد کو اخلاقی ذمہ داری کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہو۔ جو سوسائٹی اپنے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ان دونوں تدبیروں میں سے محض کسی ایک ہی تدبیر پر اکتفا کرتی ہے وہ اپنے آپ کو ایک دائمی خطرے میں مبتلا رکھتی ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کے متعلق چند اشکالات

سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۹۵ پر آپ لکھتے ہیں: "پہلا جزء یہ ہے کہ انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت واقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ دعوت عام ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق چیزوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے ...." کیا دعوتِ توحید کے ساتھ رہائی بنی اسرائیل کا مطالبہ جو حضرت موسیٰ نے کیا غیر متعلق چیز نہ تھی؟

پھر آپ لکھتے ہیں: "دوسرا جزء یہ ہے کہ جتھا ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان بوجھ کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں"۔ کیا سب بنی اسرائیل ایسے ہی تھے؟ کیا ان کے اعمال سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے؟ کیا فرعون کے غرق ہونے سے پہلے ان میں سے کسی

نے بھی دینِ موسوی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ حالانکہ کسی خاص سعی اور کشمکش کا پتہ قرآن پاک سے نہیں چلتا جس کی بنا پر بنی اسرائیل کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ تمام کے تمام مخالف طاقتوں کے زیر دست رہنے کے باوجود ایک دم ایمان لے آئے ہوں۔ جو برتاؤ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ کیا وہی برتاؤ حضرت موسیٰ کے ساتھ اس زمانہ کے کچھ بنی اسرائیل حکومت کی طاقت کو حرکت میں لا کر کر سکتے تھے۔ اور اگر ان میں کچھ کافر تھے تو وہ فرعون کے ساتھ غرق ہوئے یا نہیں؟ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ۔ یہ حضرت ہارونؑ کا مقولہ ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل ہی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ میں تمھیں لڑانے آیا ہوں۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا قصہ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں میں جو قرآن مجید کے آخری حصہ میں ملتی ہیں، یہ ذکر کیا جا چکا تھا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو خدا کی بندگی قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ مثلاً سورۂ نازعات میں ارشاد ہوا ہے: اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی۔ فَقُلْ ھَلْ لَّکَ اِلٰٓی اَنْ تَزَکّٰی۔ وَاَھْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی۔ اس میں ہانیٔ بنی اسرائیل کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ البتہ بعد کی مکی سورتوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ منصب نبوت پر حضرت موسیٰ کے تقرر کے دو مقصد تھے۔ اوّل فرعون اور اس کی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دینا۔ دوسرے اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کرے تو پھر اس مسلمان قوم کو، جو حضرت ابراہیم کے وقت سے مسلمان چلی آرہی تھی اور حضرت یوسف کے بعد چار پانچ صدیوں کے دوران میں کسی وقت کفار سے مغلوب ہو کر رہ گئی تھی، کفار کے تسلط سے نکالنے کی کوشش کرنا۔ حضرت موسیٰ نے پہلے مقصد کی طرف پہلے دعوت دی اور دوسرے مقصد کو بعد میں لیا۔ دوسرے مقصد کو پہلے مقصد سے غیر متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔

یہ سوال کہ کیا سب بنی اسرائیل نے دینِ موسوی قبول کر لیا تھا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے خیال میں بنی اسرائیل غالباً کافر تھے، اور حضرت موسیٰ شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کو دینِ اسلام کی طرف دعوت

دی۔ حالانکہ فی الواقع صورتِ حال یہ نہ تھی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے بنی اسرائیل میں مسلسل چار نبی آچکے تھے اور یہ لوگ اُن کی نسل سے تھے اور آخری نبی (حضرت یوسف) کو گذرے ہوئے چار پانچ سو برس سے زیادہ نہ گذرے تھے۔ حضرت موسیٰ کی آمد کے وقت بنی اسرائیل کی حالت کو اُس حالت پر قیاس کر لیجیے جو مثلاً امام غزالی کے زمانہ میں مسلمانوں کی تھی۔ وہ نہ تو کافر ہو گئے تھے، نہ ان کو کفر سے اسلام میں لانے کا کوئی سوال درپیش تھا اور نہ اُن میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا کوئی منکر تھا۔ البتہ ان کے اندر اتنا ضعف آگیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کی قیادت میں فرعون اور اس کی قوم کی طاقت سے تصادم کی جرأت کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نوجوان تو حضرت موسیٰ کی قیادت میں اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے بڑی حد تک تیار ہو گئے تھے لیکن ان کے سن رسیدہ و جہاندیدہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ موسیٰؑ کا ساتھ دینے کے معنی اپنی دنیا کو تباہ کر لینے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اس حالت کا نقشہ بالکل صاف طور پر سامنے آجاتا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ اعراف۔ رکوع ۱۵۔ و سورہ یونس رکوع ۹) اس بات کا قرآن سے کہیں نشان نہیں ملتا کہ ان ضعیف الاعتقاد مسلمانوں میں سے کوئی عملاً فرعون کا ساتھ دے کر حضرت موسیٰ کی مخالفت کر رہا تھا، بلکہ قرآن اور توریت دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے مسلمہ لیڈر بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر چلے تو ایک اسرائیلی بھی پیچھے نہ رہا۔ حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں جس تنزل کو بنی اسرائیل پہنچے، اس پر بنی اسرائیل کو قیاس کرنا درست نہیں۔

حضرت ہارون نے جو کچھ حضرت موسیٰ سے کہا تھا، اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اصل لیڈر اور ان کے جماعتی نظام کے ذمہ دار حضرت موسیٰ تھے اور حضرت ہارون ان کے مددگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں حضرت ہارون کسی غیر معمولی اہمیت رکھنے والے معاملے پر کوئی فیصلہ کُن کارروائی کرتے ہوئے اس بنا پر ڈرتے تھے کہ کوئی ایسی بات ان سے نہ ہو جائے جو اصل ذمہ دار شخص کی پالیسی کے خلاف ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔

مسیح علیہ السلام کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے، وہ بالکل دوسرے حالات سے متعلق ہے۔ اس وقت کوئی اسلامی نظام جماعت یہودیوں میں موجود نہیں تھا کہ حضرت مسیح کے اس قول کو یہ معنی پہنائے جا سکیں کہ آپ اس نظام جماعت کو درہم برہم کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بخلاف اس کے حضرت ہارون کے سامنے ایک مکمل اسلامی نظام جماعت موجود تھا اور وہ بجا طور پر اس امر میں احتیاط برت رہے تھے کہ کہیں ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو اس نظام جماعت کو درہم برہم کر دے۔

قصۂ یوسفؑ میں دین الملک کا مفہوم

"مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ، میں "دین الملک" سے کیا مراد ہے؟"

اس سوال کا جواب میں اس سے پہلے ترجمان القرآن جلد ۲۱ کے عدد ۳، ۴، ۵، ۶، (مشترکہ) بابت ماہ رمضان، شوال، ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ میں تفصیل سے دے چکا ہوں۔ مختصراً یہ جان لیجیے کہ اس آیت میں دین الملک سے مراد بادشاہ کا قانون ہے جو مصر میں رائج تھا، اور مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ کے معنی یہ ہیں کہ "یوسف کا یہ کام نہ تھا کہ اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے تحت گرفتار کرتا"۔ اس معنی کی کثرت نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو آیت مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ (سورہ آل عمران - ۸) اسی بنا پر حضرت یوسف کے آدمیوں نے (اغلباً خود حضرت ہی کی ہدایت کے مطابق) برادرانِ یوسفؑ سے دریافت کیا کہ چور کے متعلق تمھارے ہاں کا قانون کیا ہے۔ اور جو قانون انھوں نے بتایا اسی پر عمل کیا گیا، کیونکہ وہ شریعتِ ابراہیمی کا قانون تھا۔

حبشہ پر مسلمانوں کے حملہ آور نہ ہونے کی وجہ

"مصر کے مفتوح ہو جانے کے بعد، خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں حبشہ کی جانب فتوحات کے لیے قدم کیوں

نہ بڑھایا گیا؟ کیا محض اس وجہ سے کہ وہاں کے ایک سابق حکمراں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور ایک سابق بادشاہ مسلمان ہوگیا تھا؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس مکمل مواد موجود نہیں ہے۔ البتہ ابوداؤد اور مسند امام احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملتا ہے جس میں حبش کے متعلق آپ نے یہ پالیسی متعین فرمائی تھی کہ "دعوالحبشة ما ودعوکم" یا "اترکوا الحبشة ما ترکوکم" یعنی حبشی جب تک تمھیں چھوڑے رکھیں تم بھی انھیں چھوڑے رکھو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خلفاء راشدین کے دور میں حبشہ کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس ارشاد میں جو مصلحت تھی ممکن ہے کہ اس میں کسی حد تک اس بات کا بھی لحاظ ہو کہ اہل حبشہ نے مسلمانوں کو ان کی مصیبت کے وقت جو پناہ دی تھی اس کی رعایت کی جائے اور اپنی طرف سے حبش پر پہل نہ کی جائے تاکہ دنیا کو کبھی یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مسلمان ایک احسان فراموش جماعت ہیں۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے، وہ یہ کہ حبشہ کی جغرافی پوزیشن اور اس کی سابق تاریخ کو دیکھتے ہوئے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوگا کہ اسلام کے جغرافی مرکز یعنی حجاز کی حفاظت کے لیے حبش سے تعلقات کا درست رہنا سیاسی حیثیت سے ضروری ہے، لہٰذا جہاں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے وہ پُرامن طریقے سے حبش میں پھیلائی جاتی رہے، لیکن جنگ سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے۔

مسلمان جبّاروں کے معاملہ میں صحیح اسلامی روش

"مولانا اسماعیل شہیدؒ اپنی مشہور تصنیف منصب امامت میں "سلطنت جابرہ" کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

۱- "باید دانست کہ سلطان جابر عبارت است از شخصے کہ نفس امارہ بر وجدے شورش کند کہ نہ خوف خالق مانع اومی تواند شد و نہ شرم مخلوقین، و در اجرائے مقتضیات نفس خود مطلقاً سریع دارد:

پاس عرف۔ ہرچہ نفسِ امارہ او را می فرماید، بلا تکلف آں را بجا می آرد۔ مخالفت و موافقتِ شرع پروا ندارد، بلکہ ہمیں استیفائے لذاتِ نفسانیہ را ثمرۂ سلطنتِ خود می شمارد۔ ہمیں را سلطنتِ جابرہ می گویم"۔

ب۔ "قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان ہذا الامر بدء نبوۃ و رحمۃ ثم یکون خلافۃ ثم ملکا عضوضا ثم ملکا جبریۃ وعتوا و فسادا فی الارض یستحلون الحریر والفروج والخمور یرزقون علی ذلک وینصرون حتی یلقوا اللہ۔ و ایں سلطنتِ فسق و ظلم در حق امتِ ملت بلائے ست بس عظیم"۔

ج۔ "حتی کہ ضعفاء و غرباء مسلمین تسلطِ کفار نابکار را از تسلط ایں جابرہ بہ ہزار درجہ بہتر می شمارند و آں را باعثِ اطمینانِ خلق اللہ می انگارند"۔

د۔ "پس قیامِ سلطنتِ ظالمہ مثل انتشارِ مذاہبِ باطلہ است کہ قوانینِ ملت را برہم می زند و آئینِ سنت را کم می کند"۔

س۔ "و ہیچ اسمے از اسماءِ خالقِ اکبر نیست کہ ایں جاہلِ ابتر ذاتِ خود را بآں لقب نہ نہادہ و ہیچ منصبے از مناصبِ انبیاء و مرسلین نیست کہ ایں عدوئے دین ادعائے آں نہ نمودہ"۔

ص۔ "قسمِ ثانی آنکہ سلطانِ جابر در دل ایں قدر خوفِ الٰہی نمی دارد کہ افعالِ شرعیہ را با خلاصِ نیت بجا آرد بلکہ آنرا ہم بطریقِ رسم و عادت و نیز برائے حصولِ نیک نامی درمیانِ اہلِ زمان و اظہارِ مسابقت بر اقران بعمل می آرد و آں را نیز از لوازمِ جاہ و جلالِ خود می شمارد"۔

ض۔ "نکتۂ ثالثہ۔ سلطان بلا ریب محتاجِ امر بالمعروف است و اظہارِ حق بحضور او افضلِ عبادات۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر۔ فاما امر بالمعروف او را بوجہے باید کرد کہ بحدِ مخالفت و منازعت نہ کشد و بمرحدِ بغی و خروج نہ رسد، کہ خروج بر امام جابر

شرعاً جائز نہیں۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "۔ الا من ولی علیہ۔ وان رأہ یاتی شیئاً من معصیۃ اللہ فلیکرہ ما یاتی من معصیۃ اللہ ولا ینزعن طاعۃ

کیا یہ حکم صحیح ہے ؟ یزید کی حکومت کے خلاف حضرت حسین و حضرت عبداللہ بن زبیر نے جو کوشش فرمائیں، کیا وہ ناجائز تھیں ؟ کیا حضرت حسین اس چیز میں مخطی تھے ؟ جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے اپنے ایک رسالہ میں، جس کا ترجمہ "حسین و یزید" کے نام سے ہوا ہے، فرمایا ہے۔[1] اگر سلطنت جابرہ کے خلاف کوشش کرنا ضروری ہے تو دیگر صحابہ نے حضرت حسین کا کیوں ساتھ نہ دیا ؟ بلکہ ان میں سے بعض تو اموی خلافت تک حیات رہے، انھوں نے کیوں کوئی جدوجہد نہ فرمائی ؟

اور سلطنت ضالہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں :۔

ا۔ "در ہر امرے از امور ریاست و سیاست ملکے مخالف شرع متین ثابت میگردد و در ہر معاملہ از معاملات بنی آدم اصلے مقابل دین قائم می شود پس ملتے مقابل ملت مصطفوی برپا می شود و سنتے مقابل سنت نبوی ......"

ب۔ بالجملہ ایں سیاست سلطانی مذہبے است، غیر مذہب اسلام و ملتے است غیر ملت سید الانام بشابہ بسائر مذاہب باطلہ مثل ہنود و مجوس، نہ مثل شیعہ و خوارج "۔[2]

ج۔ "ہر چند امثال ایں سلاطین فی الحقیقت از قبیل اشرار کفار اند و از جنس اہل نار۔ فاما از بس کہ بزبان خود دعویٔ اسلام می کنند، پس کفر ایشاں مستور است و ایمان ایشاں ظاہر۔ و شاہد تصدیق ہمیں دعوائے ظاہری از رسوم اسلام مثل عقد نکاح و ختان و اظہار تجمل بروز عید الفطر و عید الاضحیٰ

---

[1] خطاء کی وجہ غایباً تفریق شمل امت بیان فرمائی ہے۔

[2] اسلام میں ملوکیت کی گنجائش ڈھونڈنے والوں کو یہ حوالے ضرور غور سے دیکھنے چاہئیں۔ کہیں مولانا اسماعیل شہید بھی "یورپ زدہ" تو نہیں تھے ؟

وتجہیز و تکفین و نماز جنازہ و دفن در مقابر مسلمین، درمیان خود جاری دارند۔"

د ۔ "بالجملہ چوں سلطنت جابرہ بحد سلطنت ضالہ رسد، از سرحد فسق و ظلم در اقسام بدعت ضلالت داخل گردید۔ پس حکم سلاطین مضلین حکم سائر فرق باطلہ مبتدعین است۔ اختلافیکہ در تکفیر و عدم تکفیر مبتدعین واقع است، ہموں اختلاف در تکفیر و عدم تکفیر سلاطین مضلین متحقق"۔

س ۔ "نکتۂ اول . . . . وریاستِ او بہ نسبت دین سمے است۔ قائل و امامت او بحکم کتاب و سنت وہبے است باطل۔ اما از آں جا کہ راہ معاملہ اسلام با او مشکوک است، تکفیر او مشکوک۔ بنا و علیہ اظہار بغی بر شے و خروج از اطاعت او نیز از مسائل اختلافیہ است . . . . . . و چوں بغی و خروج بر سلاطین مضلین احتیاطاً ممنوع است، سلطنت ایشاں از اقسام امامت معدود است"

س ۔ "نکتہ ثانیہ . . . . مگر آں کہ قیام خلافت راشدہ یا سلطنت عادلہ بر تقدیر برہم زدن ریاست او متیقن باشد پس دریں صورت بر افراختن اعلام قتل و قتال و بر انداختن آں مبتدع ضال در حق ملت و اہل ملت منفعتے خواہد بخشید، والا بعوام و خواص بے شک مضرتے خواہد رسید۔"

کیا یہ شرط صحیح ہے؟ اور کیا اس شرط کے پائے جانے پر بھی معاملہ صرف منفعت تک رہتا ہے، وجوب ثابت نہیں ہوتا؟ حالانکہ سلطنت کفر کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:۔

ذ ۔ "تنبیہ رابع در بیان سلطنت کفر۔ باید دانست کہ مراد از سلطنت کفر دریں مقام حکومت کفار اصلی نیست بلکہ مقصود ازاں سلطنت قومے است کہ جان خود را در زمرۂ مسلمین می شمارند و موجبات کفر صریح بعمل می آرند۔ جہاد بر ایشاں از ارکان اسلام است و اعانت ایشاں اعانت بیدالانام۔ پس ایں قسم سلاطین بلاشک از جنس کفار متمردین اند و زنادقہ مرتدین۔ کما عن والہ عبادۃ ابن الصامت انہ قال بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لا ننازع

الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔"

ب۔ "و قیام سلطنت ارتداد مشابہ غلبۂ کفار است، کہ بر زمرۂ مسلمین فرض عین می شود کہ بروجہاد قائم بگردانند و این خورش و فساد را بشمشیر بنشانند، وگرنہ توانند از آن اقلیم ہجرت نمایند و بدار الاسلام فرود آیند۔"

یہاں مذکورہ بالا خرابیوں سے جہاد کو کیوں مشروط نہیں کیا؟ پھر لطف یہ کہ مولانا، خاتمہ تنبیہ ثانی و نکتۂ ثانیہ میں متعارض الظواہر احادیث نقل فرما کر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"و تحقیق کلام دریں مقام آنست کہ ترک معاونت سلطان جابر و خلع بیعت او و اظہار خروج برو، یا بنا بر سرزنش جرم اوست و معاونت ظلم او و تسکین لہب غضب کہ بسبب تعدی او افروختہ و تسلی قلب کہ بنا بر جور او سوختہ، یا بنا بر حفظ ملت و نظم امت است کہ بسبب شیوع فواحش و تبدیع در احکام ملت فتنہ و فساد راہ یافتہ و بسبب ظہور ظلم و تعدی نظم امت ہباء رفتہ۔ پس اول بغایت مردود است و از اخبث معاصی، و ثانی بغایت محمود است، از افضل عبادات و طاعات!"

پھر کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"پس باید دانست کہ مقصود از نصب امام حفظ احکام ملت است و نظم اجتماع امت۔"

کیا یہ پورا مقصود ہے؟ اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیے گا تو ایک مفید چیز ثابت ہوگی۔

مولانا اسمٰعیل شہید کی جن عبارات کو آپ نے نقل کیا ہے اور ان کے متعلق جو سوالات کیے ہیں، اُن کے بارے میں میری تحقیق یہ ہے کہ جہاں تک کفار کی حکومت کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو صاف ہے، یعنی اس حکومت کو اسلام کی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد تمام جائز طریقوں سے کی جانی چاہیے۔ البتہ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حکومت کے معاملے میں احتیاط ضروری ہے تاکہ ایک خرابی کو مٹانے کی کوشش میں کوئی اس سے بڑی خرابی رونما نہ ہو جائے۔ یہ امر کہ نصیحت اور تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اصلاح کی کوشش کی جائے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ یہ امر کہ بگڑے ہوئے نظام کو بزور درست کرنے کی کوشش کی جائے، اسی میں اختلاف رونما ہوا ہے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں، جو شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس بگڑے ہوئے نظام کو بدل دینے کے لیے کافی قوت رکھتا ہے اور جس کی نیت اپنے لیے حکومت حاصل کرنا نہ ہو بلکہ شریعتِ الٰہی کی حکومت قائم کرنا ہو، اس کے لیے اُٹھنا اور جدوجہد کرنا فرض ہے، نہ کرے گا تو گنہ گار ہوگا۔ اور جسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ اصلاح حال کی قدرت نہیں رکھتا اور ظالم حکومت کے مقابلہ میں خروج کا نتیجہ بجز فساد کے اور کچھ نہ ہوگا، اس کے لیے خروج کرنا جائز نہیں ہے اور احسن یہی ہے کہ یا تو وہ پرامن طریقوں سے اصلاح کی کوشش کرے یا گوشہ نشین ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہدایات اس سلسلہ میں ملتی ہیں، وہ میرے اخذ کردہ دونوں نتیجوں کی تائید میں ہیں۔ ایک طرف حضور یہ فرماتے ہیں:

ما من نبی بعثه الله فی امته قبلی الا کان من امته حواریون واصحاب یاخذون بسنته ویقتدون بامره۔ ثم انها تخلف من بعدهم خلوف یقولون ما لا یفعلون ویفعلون ما لا یؤمرون۔ فمن جاهدهم بیده فهو مومن۔ ومن جاهدهم بلسانه فهو مومن۔ ومن جاهدهم بقلبه فهو مومن۔ ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل۔

مجھ سے پہلے جو انبیاء اپنی اپنی امتوں میں آتے رہے ہیں ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا کیا ہے کہ ابتداءً ان کی امتوں میں ایسے حواری اور اصحاب ہوتے تھے جو ان کی سنت پر چلتے اور ان کے احکام کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوتے گئے جو وہ باتیں بناتے تھے جن پر ان کا عمل نہ تھا اور وہ حرکتیں کرتے تھے جن کا انھیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تو ایسے لوگوں کے خلاف جو ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں ان سے نفرت رکھے اور ان کے زوال کا آرزومند ہو) وہ بھی مومن ہے اور جہاں یہ بھی نہ ہو وہاں ایک رائی کے دانہ برابر بھی ایمان نہیں ہے"۔

دوسری طرف فرماتے ہیں:۔

یکون بعدی ائمة لا یهتدون

میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میری ہدایت پر چلیں گے

بهدای ولا یستنون بسنتی وسیقوم فیهم رجال قلوبهم قلوب الشیاطین فی جثمان انس. قال حذیفة قلت "کیف اصنع یا رسول الله ان ادرکت ذلک؟" قال تسمع وتطیع الامیر وان ضرب ظهرک واخذ مالک، فاسمع واطع"

تیری سنت کی پیروی کریں گے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جن کے دل انسانی قالب میں شیطانوں کے سے دل ہوں گے۔ حضرت حذیفہ نے پوچھا اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو کیا کروں؟ فرمایا امیر کی سنو اور اطاعت کرو۔ اگرچہ تمھاری پیٹھ پر کوڑے برسائے جائیں اور تمھارا مال چھین لیا جائے تب بھی سنو اور اطاعت کرو"۔

اور تیسری طرف یوں فرمایا:

یوشک ان یکون خیر مال مسلم غنم یتبع بها شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینه من الفتن۔

ایک وقت آئے گا کہ مسلمان کا بہترین مال وہ بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتا رہے گا۔

ان تینوں قسم کی احادیث سے (جن کے مضمون میں متعدد اور احادیث ملیں گی) اگر وہ نتیجہ نکالا جائے جو میں نے بیان کیا ہے، تو پھر یہ باہم متعارض حدیثیں ہیں۔ ان کا تعارض اگر رفع ہو سکتا ہے، تو وہ صرف اس تاویل سے کہ تین مختلف ہدایات دے کر مسلمانوں کو چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر صاحب عقل و بصیرت آدمی اپنے لیے خود راہ عمل تجویز کر سکے۔ امام حسینؓ اور ان کی طرح متعدد حضرات نے پہلی حدیث پر عمل کیا، کیونکہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ان حالات کو بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تجربے سے ان کا اندازہ غلط نکلا۔ بعض دوسرے بزرگوں نے دوسری حدیث پر عمل کیا اور وہ پُرامن طریقوں سے اصلاح حال کی کوشش کرتے رہے اور مصائب جھیلتے رہے۔ بعض بزرگوں نے تیسری حدیث پر عمل کیا اور وہ اپنے دین کو اپنی ذات کی حد تک بچانے کے لیے گوشہ گیر ہو گئے۔

فوٹو کا مسئلہ

"میرے ایک فوٹوگرافر دوست کا خیال ہے کہ اسلام نے تصویر کے متعلق جو امتناعی حکم دیا ہے وہ فوٹو پر عائد نہیں ہوتا، بالخصوص جب کہ فحش منظر کا فوٹو نہ لیا جائے۔ کیا اس حد کو قائم رکھتے ہوئے فوٹو گرافی کو پیشہ بنایا جا سکتا ہے؟ قومی لیڈروں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں لینے میں کیا حرج ہے؟

فوٹو کے متعلق اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام جاندار چیزوں کی مستقل شبیہ محفوظ کرنے کو بالعموم روکنا چاہتا ہے کیونکہ انسانی تاریخ کا طویل تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز اکثر فتنہ کی موجب بنی ہے۔ اب چونکہ اصل فتنہ صورت کا محفوظ ہونا ہے لہٰذا اس سے بحث نہیں کی جائے گی کہ اس کو کس طریقہ سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ طریقہ خواہ سنگ تراشی ہو یا موقلم یا عکاسی یا اور کوئی جو آئندہ ایجاد ہو، بہرحال وہ ناجائز ہی رہے گا کیونکہ یہ سارے طریقے اصل فتنہ کا سبب بننے میں یکساں ہیں۔ پس فوٹوگرافی اور مصوری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا اور ممانعت چونکہ جاندار اشیاء کی تصویروں کی ہے، اس لیے تمام تصویریں حرام رہیں گی، خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔ البتہ فحش تصویر میں ایک وجہ حرمت کی اور بڑھ جاتی ہے۔ اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثناء ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو اور ایسا کرنا کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لیے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہوگا۔ مثلاً پاسپورٹ پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لیے تصویریں محفوظ کرنا، اور ڈاکٹروں کا علاج کے لیے یا فن طب کی تعلیم کے لیے مریضوں کی تصویریں لینا، نیز فن جنگ میں جہاں فوٹوگرافی کا استعمال جنگی کارروائیوں کے لیے ناگزیر ہے، حکم عام سے مستثنیٰ قرار پائے گا، بشرطیکہ وہ غرض جس کے لیے اس استثناء سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو، بجائے خود حلال ہو۔ لیکن لیڈروں کی تصویریں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں، یہ سب تو بہرحال ناجائز ہیں۔ خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو اس خطرہ سے بہت قریب پہنچا دیتی ہیں جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ کانگرس کے

اجلاس میں گاندھی جی کا باون فٹ لمبا فوٹو اور پولینڈ پر روسی قبضہ کے بعد ہی اسٹالین کی تصویروں کا پولینڈ کے ایک ایک گاؤں میں درآمد کیا جانا اور جرمن سپاہیوں کا ہٹلر کی تصویر کو سینے سے لگائے پھرنا اور ہسپتال میں مرتے وقت اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگا کر جان دینا، سینما میں بادشاہ کی تصویر سامنے آتے ہی لوگوں کا کھڑا ہو جانا، سکوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامت حاکمیت ثبت کیا جانا، یہ سب بت پرستی کی جڑیں ہیں، اور اسی لیے اسلام نے تصویر کو حرام کیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر خدا کے سوا دوسرے کی کبریائی کا نقش قائم نہ ہونے پائے۔ میں تو چھوٹے بچوں کی تصویریں لینے کو بھی اسی لیے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے اور اس کی تصویر فتنہ کی موجب بن جائے۔ کنھیا جی کی بچپن کی تصویر آج تک بک رہی ہے۔ لہذا آپ اپنے دوست کو سمجھا دیجیے کہ ان کا پیشہ شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کا خوف رکھتے ہیں تو بتدریج اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کریں۔

"انٹرنس کے امتحان میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں شرکت، امتحان کے لیے درخواست کے ہمراہ فوٹو ارسال کرنا لازمی ہے۔ پھر کیا ایسی صورت میں فوٹو کھنچوانا جائز ہے؟ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیت العلماء نے اس صورت کو جائز فرمایا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فعل جائز کیونکر ہو سکتا ہے؟"

اس معاملہ میں مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب کے فتوے سے اتفاق ہے۔ فوٹو کھنچوانا اگرچہ ناجائز ہے لیکن جہاں کسی حقیقی تمدنی نقصان سے بچنے یا کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فوٹو کا استعمال ناگزیر ہو، وہاں صرف اس ضرورت کی حد تک ایسا کرنا جائز ہے۔ امتحانات کے سلسلہ میں چونکہ یہ تجربہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگ دھوکا دے کر کسی دوسرے شخص کو اپنے بجائے امتحان دینے کے لیے بھیج دیتے ہیں، اس لیے

درخواست کے ساتھ تصویر لگانا لازم کیا گیا ہے۔ اس ضرورت کو تصویر کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پورا کرنا مشکل ہے اور دھوکے اور فریب کا سدباب بھی ضروری ہے لہٰذا اس مقصد کے لیے تصویر کھنچوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک پاسپورٹ، جرائم کی تحقیقات، طبی ضروریات، جہاد اور ناگزیر تعلیمی ضروریات کے لیے فن تصویر کا استعمال درست ہے۔ اصول فقہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات

راجہ کی غائبانہ سلامی

"اسکول میں ڈرل کے بعد مہاراجہ صاحب کی سلامی ہینڈ پر اتاری جاتی ہے۔ یہ غائبانہ سلامی ہے اور اسے وفاداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بندے کو خدا کی معبودیت میں شریک ماننے سے قولاً و عملاً انکار کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے غور کے لیے مہلت دی ہے۔ آپ میری رہنمائی فرمائیں۔"

آپ سلامی تو بہرحال نہ دیں، خواہ انجام کچھ بھی ہو، لیکن اپنی حد تک اس معاملہ کو بخیر و خوبی ٹالنے کی کوشش کریں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر کو بہت ٹھنڈے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کیجیے کہ وہ اس معاملہ کو طول دینے سے خود احتراز کرے۔ اگر آپ سلامی کے موقع پر ٹل جایا کریں اور ہیڈ ماسٹر اس کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کرتا رہے تو بات چھوٹی رہے گی، لیکن اگر وہ مجبور کرے گا اور آپ کے انکار پر باز پرس کرے گا تو کیا عجب کہ بات طول کھینچ جائے، اور نہ صرف آپ کے مدرسہ میں بلکہ ساری ریاست میں اس کا اثر پھیل جائے۔ یہی پہلو آپ ہیڈ ماسٹر کو سمجھا دیجیے گا۔ اگر عقلمند ہوگا تو وہ خود خاموشی اختیار کرلے گا، ورنہ اس کو آخری مرحلہ تک پہنچ جانے دیجیے، اور سمجھیے کہ شاید آپ ہی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اس ریاست میں اس پیغام کو پھیلانے کا ایک موقع پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت پیش آجانے کے بعد اپنے آپ کو اچھی طرح تول لیجیے کہ پھر ذرہ برابر کمزوری کا اظہار نہ ہونے پائے۔ خواہ ملازمت سے برطرفی کی نوبت آئے یا ریاست سے اخراج کی۔ میں بھی آپ کے لیے استقامت کی دعا کرتا ہوں۔